محمود الحسن/ ڈاکٹر شفیق انجم

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فنِ تاریخ نویسی اور اردو ادب کی چند اہم تاریخیں

Mahmood ul Hassan

PhD scholar, Urdu Deptt. NUML, Islamabad

Dr Shafiq Anjum

Assistant Professor, Urdu Deptt. NUML, Islamabad

Art of History Writing and Some Significant Histories of Urdu Literature

History is an ancient field of study. Man and history are deeply interconnected since time immemorial. Some rules and cannons are devised to perform any literary activity and the amalgamation of these rules is called "art". In present research paper, art of history writing, its significance, evolutionary age, research about history and their inter relation have been studied analytically. Literature is reflection of life and nations seek guidance from their history. Research in hand discusses histories of Urdu literature written by Dr. Saleem Akhtar, Dr. Anwar Sadeed, Hamid Hussain Qadrio, Dr. Tabassum Kashmiri and Dr. Jamil Jalibi.

تاریخ سے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ''یہ تمام علوم بشمول سائنسی اور فنّی میں پرانا علم ہے''(۱) تاریخ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی وہی ہیں جو انگریزی لفظ ہسٹری کے ہیں۔ واضح رہے کہ ''انگریزی لفظ (History) کا مادہ یونانی لفظ "Historia" (تحقیق و تفتیش و مطالعہ) ہے''(۲) عموماً یہ لفظ دو شکلوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو خود حقیقی واقعات لکھنے اور بیان کرنے کے حوالے سے اور دوسرے حقائق کے مجموعے کے حوالے سے۔ تاریخ نے اپنی بنیاد سے آج تک بہت سے روپ بدلے اور بہت سی صورتیں اپنائیں۔ ''قصے سے حقیقت، کہانی سے سائنس، سچائی سے فلسفے اور آرٹ سے وجدان میں تبدیل ہونے کے لیے ایک لمبا فاصلہ طے کرنا پڑا۔''(۳) آج تاریخ تمام علوم کی اساس ہونے کی دعویدار ہے۔ کیونکہ دنیا میں رونما ہونے والا ہر واقعہ خواہ اس کا تعلق کسی بھی شعبہ سے ہو۔ حقیقت میں تاریخ ہے۔ دنیا میں پیش آنے والے واقعات کو تاریخ نے ایک ترتیب کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اگر ان حالات واقعات میں ربط نہ ہوتا تو ہم بلا شبہ سابقہ انسانوں کے حالات سے آگاہ نہ ہوتے۔ تاریخ دان اور سائنس دان اگر کسی سلسلے میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہی نہ

دیتے تو شاید انسان آج اس مقام پر نہ پہنچ سکتا۔ انسان اور تاریخ کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے۔ اس سلسلے میں معروف مؤرخ شرمین کینٹ کہتے ہیں ''انسان کے لیے تاریخ اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ تازہ ہوا۔''(۴)

تاریخ کیا ہے؟ اس پر بات کرتے ہوئے مختلف مؤرخین نے اپنی اپنی رائے دی ہے۔ ایک مورخ کے نزدیک انسان کے تمام اقوال و کردار کا علم تاریخ ہے۔ اگر اس بات پر غور کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی۔ لیکن کچھ حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کے مجموعے کا نام تاریخ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تاریخ دان کوئی وجہ بتائے بغیر تاریخ کے ساتھ استوار کردے۔ ایک مؤرخ کے بقول ''ماضی کی سیاست کی تاریخ اور حال کی تاریخ کا نام سیاست ہے۔''(۵) اور کسی نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے سیاست کے علاوہ حکمرانوں کے سوانحی تذکروں اور حالات جنگ کو بھی شامل کرلیا ہے۔

کوئی تاریخ کی تعریف یا اس کے میدان عمل کے پھیلاؤ سے تو اختلاف کرسکتا ہے لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا کے تمام علوم وفنون میں تاریخ کو بلند مقام حاصل ہے۔ تاریخ بڑے نفیس مزاج کی مالک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے مزاج کے خلاف کسی بات کو گوارہ نہیں کرتی۔ اسلئے مؤرخین تاریخ نویسی کے لیے ایک راہنماء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ قلم بند کرتے ہوئے مؤرخ کو ہمیشہ سادہ اور واضح زبان استعمال کرنی چاہیے۔ تحریر میں شاعرانہ لب ولہجہ اور مبہم الفاظ کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ ایک مؤرخ لکھتے ہیں ''مؤرخ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی تحریر کرے بڑے واشگاف اور سمجھ میں آنے والی زبان میں ہو۔''(٦) پروفیسر اختر وقار عظیم لکھتے ہیں۔

> تاریخ نویسی کا فن مؤرخ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ غیر ضروری باتوں اور فروعات میں پڑ کر اپنے مرکز خیال کو چھوڑ دے۔ نہ اسے زبان و بیان کے بکھیڑوں میں پڑنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ پہیلیاں بجھوانے کی۔ بلکہ اس کا فرض محض یہ ہوتا ہے کہ وہ سیدھی سادھی زبان میں ہر واقعے کو بلا کم و کاست اس کی اصل شکل میں بیان کردے۔(۷)

مؤرخ ماضی میں بیان کیے گئے واقعات کو اس طرح تحریر کرتا ہے کہ قاری اسے پڑھ کر اچھائی اور برائی میں تمیز کرسکتا ہے۔ انسان اپنے ماضی سے واقف ہے اور وہ مسلسل اس کوشش میں ہے کہ اس کا مستقبل روشن ہو اور یہ اسی صورت میں کامیاب ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ماضی سے سبق حاصل کرے اور یہ کام تاریخ کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک مؤرخ نے لکھا ہے ''عقل مند مؤرخ زمانے کے مزاج کو سمجھنے والا ہوتا ہے اور وہ آئندہ زمانے کے بارے میں اچھائی یا برائی کا فیصلہ دے سکتا ہے۔''(۸)

معیاری تاریخ لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مؤرخ جو کچھ لکھ رہا ہے اس کے بارے میں اچھی طرح معلومات رکھتا ہو۔ اس بارے میں شبلی نے لکھا ہے۔ مؤرخ اگر جنگ کا حال لکھے تو اسے اس کی جزوی تفاصیل حتیٰ کہ آلات جنگ تک میں ماہر ہونا چاہیے۔(۹)

مؤرخین کو تاریخ لکھتے ہوئے جو محنت کرنا پڑتی ہے ان میں سب سے اہم تحقیق و تدقیق ہے۔ اسی وجہ سے مؤرخ کو گورکن اور تاریخ کو مردے اکھاڑنے کا نام دیا ہے۔ تاریخ نویس قیافہ شناسی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا کٹھن راستہ ہے کہ اس پر ہمت و کوشش کے بغیر چلنا ممکن نہیں۔ اُسے قدم قدم پر حقائق تلاش کرنے ہوتے ہیں۔ سی۔ پی۔ اسکاٹ نے لکھا ہے۔ ''آزادئ

رائے کی اجازت ہوتے بھی حقائق بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں''۱۰؎ فن تاریخ نویسی کے بارے میں اختر وقار عظیم کہتے ہیں۔

> کسی بھی کام کو سلیقے سے انجام دینے کے لیے کچھ اصول اور قاعدے تشکیل دینا پڑتے ہیں۔ انہی اصولوں اور قاعدوں کے مجموعے کو فن کا نام دیا گیا ہے۔ تاریخ نویسی کے لیے بھی کچھ اصول اور قاعدے بنائے گئے ہیں۔ اچھے مؤرخ کو ہمیشہ ان اصولوں اور قاعدوں کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ جو تاریخ نویسی کے لیے متعین ہیں۔ کیونکہ تاریخ بے حد نازک مزاج ہے۔ خلاف مزاج کوئی بات برداشت نہیں کر سکتی۔(۱۱)

مذکورہ تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ اور تحقیق میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر تاریخ مسائل کے حل میں انسان کی مدد کرتی ہے تو دوسری خود تاریخ تحقیق کی مرہون منت نظر آتی ہے۔

فن تاریخ نویسی کا جائزہ لینے کے بعد اب ادبی تاریخ کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ سمجھدار اقوام اپنی تاریخ رقم کرتی ہیں جبکہ مہذب و شائستہ قومیں اپنی ادبی تاریخ کو ترتیب دیتی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ادب کی تاریخ کا معاملہ عام تاریخ کے معاملے میں خاصا نازک اور پیچیدہ ہے، اس لیے کہ یہ تاریخ کے مروج تصور کے مطابق محض ایام شماری نہیں اور نہ ہی معلومات و کوائف مرتب کرنا ہے۔ اگرچہ تاریخ میں یہ سب کچھ شامل ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ تخلیق اور تخلیق کاروں کا مطالعہ ہے۔(۱۲)

ادبی تاریخ ماضی اور حال کے درمیان تعلق پیدا کرتی ہے اور یہ دونوں زمانوں میں ایسا مضبوط رشتہ استوار کرتی ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں۔

> ادبی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آنی چاہیے کہ حال کا ماضی سے کیا رشتہ ہے اور یہ بات بھی کہ حال ماضی کو کیسے بدلتا ہے۔(۱۳)

ادبی تاریخ صرف تنقید نگاری کا نام نہیں بلکہ ادبی تاریخ تنقید و تحقیق کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ اگر تنقید سے فن پارے کے جوہر کھلتے ہیں تو تحقیق سے کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔ تحقیق، حقیقت کی دریافت اور واقعہ کی تہہ تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند:

> ادبی تاریخ ایک طرف تاریخ ہے دوسری طرف ادب یہ سوانح نگاری اور تنقید کے امتزاج سے بنی ہے لیکن اسے تحریک ملی، سیاسی تاریخ سے جس کی مماثلت پر اس نے سوانحات کو ترتیب دیا۔۔۔ سیاسی تاریخ کے واقعات ماضی کے پردہ میں مکتوم ہیں۔ جبکہ ادبی تاریخ کی ماضی کی تخلیقات ہمارے سامنے ہیں۔(۱۴)

ادب زندگی کا پرتو ہوتا ہے۔ ہر قوم اپنی تاریخ سے راہنمائی لیتی ہے۔ ہر قوم کو مطالعے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا جائزہ بھی لینا چاہیے۔ تاکہ عہد حاضر کا شعور اور ذہنی کیفیت کو بھی اس میں شامل کیا جا سکے۔ ''تاریخ ادب اردو'' کے مؤرخ لکھتے ہیں:

> اگر ادب زندگی کا آئینہ ہے تو ادب کی تاریخ کو بھی ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں ساری زندگی کا عکس نظر آ جائے۔(۱۵)

اگر اردو ادب کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو تاریخ نویسی کے حوالے سے بہت سے نام نظر آتے ہیں۔ جن میں ''آب

حیات'' کے مصنف محمد حسین آزاد، ''شعر الہند'' کے عبدالسلام ندوی، ''اردوئے قدیم'' کے شمس اللہ قدری، ''سیر المصنّفین، ''مراۃ الشعر'' کے محمد یحییٰ تنہا، ''اردو ادب کی تاریخ'' (انگریزی) کے رام بابو سکسینہ، ''تاریخ داستان اردو'' حامد حسین قادری، ''صحیفۂ تاریخ اردو'' کے مخمور اکبرآبادی، ''اردو کی ادبی تاریخ''، ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کے مصنف عبدالقادر سروری، ''تاریخ ادب اردو'' کے ڈاکٹر جمیل جالبی، 'اردو ادب کی مختصر تاریخ'' کے ڈاکٹر انور سدید، ''اردو ادب کی تاریخ'' کے تبسّم کاشمیری شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی مؤرخین نے تاریخ نویسی کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔

اردو میں اگر ادبی تاریخ کا مشاہدہ کیا جائے تو اس کی اولین شکل تذکروں میں ملتی ہے۔ مگر یہ تذکرے تاریخ نہیں بلکہ سوانح عمریاں ہیں جن کی مدد سے ہمیں مختلف ادبی شخصیات کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ قدیم تذکروں سے لے کر موجودہ تواریخ تک معاصرین کے بارے میں ظاہر کی گئی۔ منفی یا مثبت رائے میں ہمیشہ اختلافات پیدا ہوئے۔ میر تقی میر کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' شیفتہ کا تذکرہ ''گلشن بے خار'' نصر اللہ خویشگی کا ''گلشن ہمیشہ بہار'' اور قطب الدین ایبک کا ''گلشن بے خزاں'' وغیرہ پر جانبداری کے اعتراضات کیے گئے کہ انہوں نے اپنی پسندیدہ شخصیات کو اہمیت دی۔ ''آبِ حیات'' جو مولانا محمد حسین آزاد کا تذکرہ ہے کو اردو کا آخری مقبول تذکرہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں اردو تاریخ کی اولین جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ صرف شعراء کی سوانح عمری ہے۔ اس میں نثر نگاروں کا ذکر نہیں ہے وہ ''آب حیات'' میں شاعروں کی زندگی کے بارے میں ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ وہ چلتی پھرتی تصویر کا منظر پیش کرتی ہیں۔ ہوسکتا ہے مولانا کو اس دور میں اصل مآخذوں کے حصول میں دشواری کا بھی سامنا ہو لیکن ان کی تحریر میں ان کی انشاء پرداز شخصیت کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ تاریخ نویسی میں اگر واضح ٹھوس زبان استعمال نہ کی جائے تو عبارت مبہم دکھائی دینا شروع کر دیتی ہے جو تاریخ نویسی کے اصولوں کے خلاف ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد کے بعد رام بابو سکسینہ نے باقاعدہ طور پر ''اردو ادب کی تاریخ'' انگریزی زبان میں لکھی۔ مرزا محمد حسن عسکری نے مذکورہ تاریخ کا اردو ترجمہ بعض اضافوں کے ساتھ کیا۔ اردو ادب کی تاریخ نویسی میں سکسینہ کی یہ پہلی کوشش بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ رام بابو کی اس تاریخ میں بعض تاریخی اغلاط بھی موجود ہیں مثلاً وہ کوئی غیر معروف ادباء کو معروف کہتے ہیں۔ ولی دکنی کی تاریخ پیدائش و وفات غلط لکھتے ہیں۔ ''باغ و بہار'' کو امیر خسرو کی تصنیف لکھتے ہیں۔ جن کو بعد کی تحقیق نے غلط ثابت کیا۔ مگر اس کے باوجود سکسینہ کی تاریخ کی اہمیت اپنی جگہ پر موجود ہے۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> رام بابو سکسینہ کی کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی اس کی تسوید اس سے پہلے کے دو تین برسوں میں ہوئی۔ اس وقت تک جدید تحقیق اور تنقید دونوں کا آغاز ہی ہوا تھا۔ ان کو جو تحقیق وراثت میں ملی اسے نظر میں رکھا جائے تو اس کے تسامحات قابل درگزر ہیں۔ (۱۶)

سکسینہ کی تاریخ کی اہم بات یہ ہے کہ وہ ان کی اپنی ذاتی لکھی ہوئی ہے۔ ان تاریخوں کی طرح نہیں جنھیں دو یا دو سے زیادہ افراد نے مِل کر مرتب کیا ہو۔ تحقیق و تنقید کے حوالے سے ''آب حیات'' اور سکسینہ کی تاریخ میں بہت دوری نظر آتی ہے۔ جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' نے یہ فاصلہ کم کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا تحقیقی کارنامہ ''تاریخ ادب اردو'' ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ جالبی کی تاریخ

نویسی کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ بحیثیت مؤرخ تاریخ نگاری کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی جائے۔ بقول جالبی:

ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عواملِ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت اور ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ اور تاریخ ادب ان سارے اثرات، روایات، محرکات اور خیالات و رجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔ (۱۷)

''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

جب تک ادبی مؤرخ کے پاس نقاد کا تخلیقی ذہن اور کسوٹی بننے والی آنکھ نہ ہوگی اس وقت تک وہ تحریر اور تخلیق میں امتیاز نہ کر پائے گا۔ لہٰذا ادبی مؤرخ کے لیے حسن ذوق (یا پھر ذوقِ حسن) کے ساتھ تنقیدی نگاہ اور تخلیقی ذہن اور زندگی کے بارے میں سائنٹیفک شعور بھی ہونا چاہیے۔ (۱۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت میں ہمیں تخلیقی وتنقیدی دونوں صلاحیتیں نظر آتی ہیں۔ ان کی تاریخ میں سن، مصنّفین کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں، مختلف مآخذوں اور ان کے شائع ہونے کی تاریخ، زندگی کے دوسرے اہم واقعات پر بھی گہری تحقیقی وتنقیدی آگہی کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ ''تاریخ ادب اردو'' کے جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس موضوع یا شخصیت کو لیتے ہیں اس میں تحقیق وتنقید کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ ان کی تاریخ میں تحقیق وتنقید میں باہم توازن ہے۔ یہ وہ فرق ہے جو انہیں دوسرے مؤرخین سے نمایاں کرتا ہے۔ جمیل جالبی کہتے ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ اصل مآخذوں سے استفادہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

میں نے ادبی تاریخ نویسی کی بنیاد دوسروں کی سنی سنائی باتوں پر نہیں رکھی۔ بلکہ سارے کلیات، ساری تصانیف، کم وبیش سارے اصلی تاریخی، ادبی وغیر ادبی مآخذ سے براہ راست استفادہ کر کے روح ادب تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ (۱۹)

ڈاکٹر جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اوّل) میں اردو کی ابتداء سے ۔۔۔ تک کی تاریخ بیان کی ہے۔ پہلی جلد کو جالبی نے چھ فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس جلد میں ہر فصل کی پہلے باب میں اس عہد سے متعلقہ تہذیب وتمدن، ادبی ولسانی، خوبیوں کے ساتھ ساتھ معاشرتی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ادبیات ولسانیات کے ساتھ ساتھ انھوں نے اہم ادباء اور معروف شعراء کی تخلیقات کا بھی تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ جالبی نے اپنی تاریخ میں شاعروں اور نثر نگاروں کو یک جا رکھا ہے۔

موجودہ دور میں ہماری تحریریں تحقیقی وتنقیدی شعور سے خالی ہیں۔ ہمیں آج منصوبہ بندی کرنا ہوگی کہ طلبہ میں تحقیق اور تحقیقی شعور کس طرح بیدار کیا جائے۔ اس لیے ہمیں اپنی نوجوان نسل کو بتانا ہوگا کہ تحقیقی انداز فکر مسلمانوں کا ورثہ ہے۔ ماضی میں مسلمانوں نے اسی انداز کو اپنائے رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے تخلیقی وتحقیقی میدان میں کامیابیاں حاصل کیں۔

تحقیق دراصل ایک انداز فکر ہے جو ہمیں حق کی طلب اور سچائی کی تلاش اور کھوج لگانے پر آمادہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کی سماجی تاریخ کے آغاز سے ہی اس انداز فکر کا سراغ ملتا ہے۔ (۲۰)

ڈاکٹر تبسّم کاشمیری اردو ادب کا جانا پہچانا نام ہے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں، نقاد، ناول نگار اور شاعر کی

حیثیت سے کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تاریخ نگاری کے میدان میں ''اردو ادب کی تاریخ'' ان کی ممتاز تخلیق ہے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں اردو کی ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک کے عرصے کو شامل کیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں موجودہ عہد کو شامل نہیں کیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادبی میدان میں تبسّم کاشمیری کا کیا کردار ہے۔ انھوں نے تاریخ کے میدان میں کیا نئی جہتیں پیدا کی ہیں۔ ماضی کی تاریخ کا جائزہ لینے کے لیے کن کن مآخذ سے رجوع کیا گیا ہے اور ادبی تاریخ کے متعلق ان کا کیا نظریہ ہے؟

تبسّم کاشمیری نے اپنی کتاب ''اردو ادب کی تاریخ'' کو انیس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پیش لفظ میں ڈاکٹر صاحب نے مختلف ادبی تاریخوں اور تاریخ دانوں کے طریقہ کار پر گفتگو کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادبی تاریخ کو کن تناظر میں جانچتے ہیں اور ان کی نظر میں ایک اچھے مؤرخ میں کون کون سی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ بقول ڈاکٹر تبسّم:

> ادب مؤرخ کا بنیادی کام ادبی ذخائر کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک ادبی محقق کا کام ماضی کے ذخائر کو دریافت کرنا ہے۔ حقائق واقعات اور سوانحات کی صحت کو جانچنا ہے۔ ماضی کے تسامحات کو دور کرنا ہے اور مختلف افراد سے منسوب غلط روایات کی تردید کرنا اور تحقیقی کام میں درست حقائق کو سامنے لانا ہے۔ اس لحاظ سے ادبی مؤرخ کو محقق بھی ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی تنقیدی بصیرت کا مالک بھی ہونا چاہیے۔ (۲۱)

اچھے مؤرخ کے لیے جہاں ایک اچھا محقق اور تنقید نگار ہونا شرط ہے وہیں اس میں تخلیاتی حس بھی موجود ہونی چاہیے۔ چونکہ جب ایک مؤرخ ماضی کے حالات و واقعات کی ٹوہ لگاتا ہے تو وہ روحانی طور پر ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس لیے اس دوران جس قدر وہ بلند تخیل کا حامل ہوگا۔ اس حد تک وہ ماضی میں گم کہانیوں اور کرداروں کی تصورکشی کر سکے گا۔ ڈاکٹر کاشمیری کے بقول:

> ادبی مؤرخ ماضی کے اندھیرے منظروں میں سفر کرتا ہے خوابیدہ داستانوں کو بیدار کرتا ہے۔ گرد میں دبی ہوئی دستاویزات کو جھاڑتا ہے۔۔۔ ماضی کی بازیافت کے لیے مؤرخ کا متخیلہ نہایت تیز ہونا چاہیے۔ (۲۲)

اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں مؤرخ کے تاریخی شعور اور ذہنی بلوغت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جب بھی کوئی تاریخ نویس تاریخ لکھنا شروع کرتا ہے تو ادبی تاریخ کے بارے میں مواد تو ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جب مؤرخ لکھنا شروع کرتا ہے تو اس کی شخصیت کا عکس اس تحریر میں جھلکتا ہے۔ تبسّم کاشمیری نے ای۔ ایچ۔ کار کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

> تاریخی حقائق واقعات وغیرہ مؤرخ کے پاس اس طرح موجود ہوتے ہیں جیسے مچھلی فروش کے تختے پر مچھلی۔۔۔ ادبی مؤرخ تاریخ کے تختہ سے مطلوبہ حقائق فراہم کرتا ہے۔ گھر لے کر ان کی طباخی کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے تیار کر کے پیش کر دیتا ہے۔ (۲۳)

''اردو ادب کی تاریخ'' اچھوتا انداز تحریر لیے ہوئے ہے۔ جب قاری اس کا مطالعہ کرتا ہے تو زنجیر سے زنجیر ملتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح پڑھنے والے کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ یہ وہ اہم نکتہ ہے جو ڈاکٹر تبسّم کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ کہ دوران مطالعہ بارہا مصنف کی شخصیت تحریر میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ اگر اس تاریخ کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر تبسّم ایک اچھے تنقید نگار کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔ اور ان کا تنقیدی مزاج پوری تاریخ کو اپنی گرفت میں لیے

ہوئے ہے۔ڈاکٹر تبسّم کی تاریخ کو اگر تحقیق کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں بعض مقامات پر اصل مآ خذ کی بجائے ترجمہ شدہ ثانوی مآ خذ پر انحصار کیا گیا ہے جبکہ ادبی مؤرخ کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اصل مآ خذ سے براہِ راست استفادہ کرے ورنہ یہ تحقیق کی بجائے تبصرہ دکھائی دے گی۔

ڈاکٹر انور سدید کی ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' فروری ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔مصنف نے کتاب کو تیرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔انور سدید نے اردو ادب کے آغاز سے ۱۹۸۶ء تک مختلف اصناف سخن کو بالترتیب ایک جلد میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ مذکورہ تاریخ میں تنقیدی امور سے صرف نظر کرتے ہوئے ادیبوں کی اہم شخصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔انور سدید لکھتے ہیں:

> کتاب کی محدود ضخامت کو مدنظر رکھتے ہوئے تاریخی حالات اور تنقیدی مباحث میں بقدرضرورت کفایت سے کام لیا گیا ہے اور ادباء کی نمایاں امتیازی خصوصیات تک محدود رہنے کی سعی کی گئی ہے۔(۲۴)

ادبی تاریخ ماضی کا عکس ہوتی ہے۔تاریخ ہمیں ماضی کی تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ اس وقت کی اہم شخصیات کے کارناموں سے روشناس کرواتی ہے۔ادب پڑھ کر انسان ماضی کی کسی قوم کے فکر ونظر سے واقف ہوسکتا ہے۔ڈاکٹر انور ادبی تاریخ کے بارے کیا رائے رکھتے ہیں اس کا اندازہ ان کی اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ادب کی تاریخ اشخاص اور ان کے ادبی کارناموں کا آئینہ ہوتی ،لیکن ادب اپنا تمام موادزندگی سے حاصل کرتا ہے۔چنانچہ تاریخ کے آئینے میں اس قوم کا طرز فکر واحسان اور روح بھی منعکس ہوتی ہے جس کا یہ ادب ہے۔(۲۵)

اس تاریخ کی اہم بات یہ ہے کہ یہ ۱۹۸۶ء تک کے معاصر ادب پر بحث کرتی ہے۔یہ وجہ ہے کہ اس کتاب پر بعض افراد نے تنقید کی، چونکہ مؤرخ جس دور میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔وہ اس معاشرے سے یکسر دور ہو کر زندگی نہیں گزار سکتا۔تاریخ نویس کی پسند ناپسند، مزاج، محبت ونفرت، اس کی تحریر میں نظر آتی ہے۔اس طرح اپنے معاصرین سے اختلاف رائے بھی ہوسکتا ہے۔ایک واقعہ جو کہ مؤرخ کی نظر میں اہم ہے ہوسکتا ہے کہ وہ دوسرے کی نظر میں غیر اہم ہو۔اس لیے حال کے بارے میں ادبی تاریخ مرتب کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔اس میں تاریخ نویس کو تاریخ نویسی کے اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے،تعصّبات سے بلند ہو کر حقائق کو بیان کرنا چاہیے۔''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' کے بارے میں انور سدید خود لکھتے ہیں:

> یہ تاریخ چونکہ مختصر ہے اس لیے حالات زندگی کی تفصیل پیش کرنے کی بجائے ادبی کارناموں اور خصوصیات فن کو فوقیت دی گئی ہے۔اور ادباء کی انفرادی عطا کو ہر صنف ادب میں علیحدہ علیحدہ تلاش کیا گیا۔(۲۶)

ڈاکٹر انور سدید نے مختلف ادوار میں پھیلے ہوئے اردو ادب کو ایسے انداز میں ترتیب دیا کہ طلباء کے لیے تاریخ ادب کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، میں مؤرخ کا عکس واضح دکھائی دیتا ہے۔تحریر میں تنقید کا رنگ غالب ہے۔تاریخ کی ایک جلد ہونے کی وجہ سے قیام پاکستان کے بعد کے ادب پر سرسری نگاہ ڈالی گئی جو مؤثر انداز میں ادبی تاریخ کا احاطہ نہیں کرتی۔اس بات کا اعتراف ڈاکٹر انور سدید نے بھی کیا ہے:

> ۱۹۴۷ء کے بعد کے ادب پر تو ایک مبسوط کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔فرصت ملی تو یہ کام کرنے کا آرزومند

ہوں۔(۲۷)

''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریر کردہ ہے۔ یہ تاریخ پہلی دفعہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی مذکورہ تاریخ متنازعہ ہونے کے باوجود ہر دلعزیز ہے۔ ۲۰۰۵ء میں اس تاریخ کا ستائیسواں ایڈیشن شائع ہوا جو اس کی ادبی حلقوں میں مقبولیت کا عکّاس ہے۔ مؤرخ نے تاریخ کو ۲۴ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس تاریخ کی اہم بات یہ ہے کہ اسے ہر نئے ایڈیشن کی اشاعت تک نئے اضافوں کے ساتھ مکمل رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مشفق خواجہ اس تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> یہ مختصر ترین تاریخ اردو کی مقبول ترین کتاب بن گئی ہے۔ ''آب حیات'' کے بعد یہ دوسری مقبول ترین تاریخ ادب ہے۔ جو متعدد مرتبہ شائع ہوئی۔ کسی تنقیدی و تحقیقی کتاب کا اس درجہ مقبول ہونا بذات خود ہماری تاریخ ادب کا ایک اہم وقوعہ ہے۔(۲۸)

ڈاکٹر سلیم اختر نے تاریخ کی ایک ایسی تاریخ مرتب کی ہے کہ ادبی تاریخ کے طالب علم کو ضروری معلومات اور تحقیق و تنقید کے بارے میں مناسب رائے مہیا کرتی ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''اردو ادب کی تاریخ کیا لکھی چاول پر قل ھو اللہ تحریر کی ہے۔''(۲۹) ڈاکٹر سلیم اختر مختلف کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تحریر کردہ تاریخ میں شکوہ الفاظ جھلکتا ہے۔ تاریخ میں سلیم اختر کی ادبی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول:

> کسی بھی تخلیق، تنقید یا تحقیق کی مانند تاریخ ادب بھی فرد واحد کے قلم کا ثمر ہے۔ وہ ایک نقطۂ نظر رکھتا ہو یا متنوع تصورات کا حامل ہو یا سرے سے اس کا کوئی نقطۂ نظر ہی نہ ہو۔ یہ سب امور اس کی تاریخ میں منعکس ہونے چاہئیں۔(۳۰)

ڈاکٹر تبسم ادبی مؤرخ کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ادبی مورخ کا کارنامہ اس کی تاریخ ہے جسے اس کی ذہنی بصیرت نے تشکیل دیا ہے۔ واقعات و حقائق اس کے لیے خام مال تھے جنھیں استعمال کر کے وہ ادبی خاکہ تیار کرتا ہے اور پھر اس خاکے میں رنگ آمیزی کر کے تاریخ نگاری کا عمل سرانجام دیتا ہے۔(۳۱)

جبکہ ان دونوں مؤرخوں کے برعکس جمیل جالبی سنجیدہ، تحقیقی اور تاریخی انداز اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> تاریخ ادب لکھتے وقت میں نے رنگین، شاعرانہ اسلوب سے حتی الوسع دامن بچایا ہے۔ تاکہ اسلوب کی رنگینی اصل تاریخ کو ماند نہ کردے۔(۳۲)

ڈاکٹر انور سدید، سلیم اختر اور تبسّم کاشمیری نے اپنی تاریخ میں دلچسپ انداز اپنایا ہے۔ قاری دلچسپی سے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ مذکورہ تواریخ کے مطالعے کے دوران ہر ایک مؤرخ کا خاکہ پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ اگر تحقیقی حوالے سے دیکھا جائے تو پہلے باب میں جو اردو کے آغاز کے بارے میں مذکورہ بالا مؤرخین ترجمہ شدہ اور ثانوی مآخذ کو زیادہ سے زیادہ تلاش کیا جائے۔ جیسا کہ جالبی کی تاریخ سے قارئین کو زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور یہی خوبی ان کو دوسرے مؤرخین سے ممتاز کرتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخوں میں بعض مؤرخین نے عرق ریزی کرتے ہوئے اصل واقعات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے سرسری طور پر جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ ولی دکنی اردو ادب کے اہم شاعر ہیں لیکن

ادبی تاریخوں میں ان کی زندگی کے بعض واقعات، سعداللہ گلشن سے ملاقات، اور ولی کے سفر کے حوالے سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ڈاکٹر جالبی اپنی تاریخ میں سعداللہ گلشن اور ولی کی ملاقات کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

> دلی اور اورنگ آباد جب گھر آنگن بنے تو ولی بھی ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں سید ابوالمعالی کے ہمراہ دلی کے سفر پر روانہ ہوئے۔یہیں شاہ سعداللہ گلشن (۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۸ء) سے اس کی ملاقات ہوئی۔(۳۳)

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اپنی تاریخ میں یہی تاریخ رقم کی ہے کہ ''پہلی مرتبہ (۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء) ابوالمعالی کی معیت میں آمد ہوئی تو اس عہد کے مشہور صوفی شاہ سعداللہ گلشن سے ملاقات ہوئی۔'' [۳۴] ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے کہ ''ولی ۱۷۰۰ء میں دلی آیا تھا اور اس کی ملاقات شاہ گلشن سے ہوئی تھی۔بعض ناقدین نے اس بات کو تا حال تسلیم نہیں کیا۔'' [۳۵] ڈاکٹر تبسّم نے بھی ولی اور گلشن کی ملاقات کی تاریخ یہی لکھی ہے لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ اس روایت کو اہل دلی نے پھیلایا ہے تاکہ دلی والوں کی بڑائی قائم رہے۔ڈاکٹر تبسّم نے اس دعوے کے حق میں تحقیقی ثبوت تو فراہم نہیں کیے البتہ چند ایک سوالات غور کرنے کے لیے اٹھائے ہیں۔

> ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ولی کو تو شاہ گلشن نے مشورہ دیا تھا مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ولی کے معاصرین میں سے شاید کوئی بھی شاہ گلشن سے فیض یاب نہ ہوا تھا۔مگر وہ بھی ولی کے ہی انداز میں غزلیں کہہ رہے تھے۔یہ تتبع کا مسئلہ نہیں تھا۔۔۔شاہ گلشن کے اس مشورے کو غور سے دیکھیں تو یہ الٹا ان کے خلاف جاتا ہے۔اس مشورے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ وہ دکن کی زبان کے بدلے ہوئے اسالیب سے ناواقف تھے۔(۳۶)

تحقیق اصلی اور نقلی کی پہچان کرنے کا عمل ہے۔اسی تحقیق کی بنا پر ولی کی تاریخ وفات پر مختلف آراء سامنے آئی ہیں۔ڈاکٹر تبسّم ولی کی وفات لکھتے ہیں ''اس کا انتقال ۱۷۰۷، ۱۷۲۰، ۱۷۲۵ کے درمیانی عرصے میں ہوا۔'' [۳۷] ڈاکٹر سلیم اختر ولی کی وفات کے بارے میں کہتے ہیں ''اگر ۱۱۱۹ھ بالعموم بالعموم سنہ وفات تسلیم کیا جاتا ہے لیکن جمیل جالبی کے خیال میں ''۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۰، ۱۱۲۸ھ/ ۱۷۲۵ کے درمیان سنہ وفات ہے۔'' [۳۸] ڈاکٹر انور سدید کے بقول ''یہ جمال پسند شاعر ۱۱۲۹ھ/ ۱۷۰۵ میں فوت ہوا۔'' [۳۹]

اگر ہم غور سے دیکھیں تو ۱۷۰۷ سے ۱۷۲۵ کے درمیان ۱۸ سال کا طویل عرصہ بنتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اور انور سدید نے بھی ولی کی مختلف تاریخیں درج کی ہیں اور مزید معلومات کے لیے انہوں نے مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر جمیل جالبی وغیرہ کی کتابیں دیکھنے کے لیے کہا ہے۔اس طرح یہ مؤرخین تحقیق سے دامن بچا کر آگے نکل گئے ہیں۔جبکہ جمیل جالبی نے اپنے مضمون ''ولی کا سال وفات'' میں عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے مختلف مآخذوں تک رسائی حاصل کر کے یہ بات کہی ہے کہ ولی کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں نہیں ہوا بلکہ ۱۱۳۳ھ کے بعد اور ۱۱۳۸ھ سے پہلے متعین ہوسکتا ہے۔'' [۴۰]

> ۱۱۳۳ھ میں جب فراقی نے اپنی مثنوی ''مراۃ الحشر'' لکھی دلی بقید حیات تھے۔لیکن جب ثناء اللہ نے ۱۱۳۸ھ میں دیوان ولی نقل کیا یا جب وجدی نے ۱۱۴۴ھ میں اپنی مثنوی مخزن عشق لکھی تو ولی وفات پا چکے تھے ان شواہد کی روشنی میں ولی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ کی بجائے جو یقیناً غلط ہے ۱۱۳۳ھ کے بعد اور ۱۱۳۵ء سے پہلے بنتا ہے۔(۴۰)

حافظ محمود شیرانی نے اہم کتاب ''خالق باری'' کو خسرو کی تصنیف ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈاکٹر جالبی نے تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ مذکورہ تصنیف خسرو کی تحریر کردہ ہے۔ ڈاکٹر تبسّم کاشمیری اور دیگر مؤرخین نے اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ اسی طرح کئی اور ادبی و تاریخی واقعات مثلاً بیجاپوری عہد کے شاعر مقیم اور مرزا مقیم کی وضاحت جالبی کی تاریخ میں ملتی ہے کہ وہ دونوں علیحدہ علیحدہ شخصیات تھیں جبکہ دوسری تاریخوں میں نہایت مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ جالبی قطب شاہی عہد کے شاعر محمد قلی قطب شاہ کا تفصیلی ذکر صرف ۱۲ صفحات میں کرتے ہیں اور اسی شاعر کا ذکر ڈاکٹر تبسّم ۱۵ صفحات میں کرتے ہیں اور اس کی پیاریوں کا ذکر کر کے انشاء پردازی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' اور ''اردو ادب کی تاریخ'' کا جائزہ لیا جائے تو تحقیقی حصہ کمزور نظر آتا ہے جبکہ تنقیدی پہلو ان کی تاریخوں پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔ ان تاریخوں میں اصل مآخذوں سے استفادہ کرنے کی بجائے تنقیدوں اور ادبی تاریخوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ مؤرخین نے تاریخ پر لطف بنانے کے لیے حقائق کو اہمیت نہیں دی اور ایسے موضوعات کو نہیں چھیڑا جو بحث طلب تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک ادبی تاریخ سیاسی و سماجی، تہذیبی و ثقافتی پس منظر میں تخلیق ہونے والا ایک واقعہ ہے۔ اور اس کو واقعات کے تسلسل اور چھان پھٹک کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔ جالبی کے بقول:

> میں نے ادبی تاریخ نویسی کی بنیاد دوسروں کی آراء یا سنی سنائی باتوں پر نہیں رکھی بلکہ سارے کلیات، ساری تصانیف، کم و بیش سارے اصلی تاریخی و ادبی مآخذ و غیر ادبی مآخذ سے براہِ راست استفادہ کر کے روح ادب تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ (۴۱)

اس بات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تاریخ صرف شوقیہ طور پر لکھنے کی بجائے پوری ذمہ داری اور فرض منصبی سمجھتے ہوئے تحریر کی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> اردو ادب کے جس قدر تخلیقی اور تحقیقی کام ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر سے گزرے ہیں اتنے کسی دوسرے کی نظر سے نہیں گزرے۔ (۴۲)

ڈاکٹر تبسم، انور سدید اور سلیم اختر نے اپنی تاریخوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی تاریخ کو سراہا ہے جو ان کی تحقیقی کاوشوں کا اعتراف ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کہتے ہیں:

> تحقیق میں حزم و احتیاط ایک اچھے محقق کا طرۂ امتیاز ہے اور جالبی صاحب جب تک اہم سے اہم حوالے کی بھی جانچ پرکھ نہیں کر لیتے اسے قبول نہیں کرتے۔ (۴۳)

حوالہ جات

1. Jaffar, S.M., What is History, Sadiq Sons, Peshawar, Eddition: First, 1961, P-2

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلیکیشنز, لاہور، ۲۰۰۵ء ستائیسواں ایڈیشن، ص ۱۵

3۔ Jaffar, S.M., What is History, P-503

4۔ Kent, Sharman, Writing History, Appleton Century Crofts Inc. New York, Eddition:First, 1941, P-1

5۔ Dutt, R.P.,Problems of Contemporary History, Lawrance and Wishert, London Eddition: First, 1963, P-20

6۔ Kent, Sharman, Writing Hisotry, P-42

۷۔ وقار عظیم، اختر، شبلی بحیثیت مؤرخ، ابلاغ پبلشرز، اردو بازار، لاہور، ص ۲۲

۸۔ ذکاءاللہ، مولوی،، تاریخ ہندوستان، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد اوّل، بار دوم، س۔ن، ص ۵

۹۔ شبلی نعمانی، الفاروق، مشمولہ شبلی بحیثیت مؤرخ، ابلاغ پبلشرز لاہور، ص ۲۷، ۲۸

10۔ Carr, E.H.,What is History, Penguin Books London. Eddition:Third, 1965, P-9-10

۱۱۔ وقار عظیم، اختر، شبلی بحیثیت مؤرخ، ابلاغ پبلشرز، ص ۱۹

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۱۵

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، جلد دوم، طبع دوم، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳

۱۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۲۱

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی اردو، لاہور، ص ۱۳

۱۶۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ص ۲۰۴

۱۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، جلد اوّل، ۱۹۷۸ء، (مقدمہ)

۱۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۱

۱۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم (دیباچہ)

۲۰۔ ایس۔ایم، شاہد، تعلیمی تحقیق، مجید بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۶

۲۱۔ تبسّم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳

۲۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، جلد اوّل، فروری ۱۹۹۱ء، ص ۷
۲۵۔ ایضاً، ص ۲، ۳
۲۶۔ ایضاً، ص ۵
۲۷۔ ایضاً، ص ۵
۲۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۹
۲۹۔ ایضاً، ص ۹
۳۰۔ ایضاً، ص ۲۱
۳۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۱۳
۳۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی اردو، جلد دوم، ص ۱۲
۳۳۔ ایضاً جلد اوّل، ص ۵۳۰
۳۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۱۴۵
۳۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، ص ۱۰۹
۳۶۔ تبسّم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۱۷، ۲۱۸
۳۷۔ ایضاً ص ۲۱۵
۳۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۱۴۳
۳۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، ص ۱۰۹
۴۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ولی کا سال وفات، مشمولہ: دریافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء
ص ۵۶۸، ۵۶۹
۴۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی اردو، جلد دوم، (مقدمہ)
۴۲۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخیں، انجمن ترقی اردو، ص ۶۹۰
۴۳۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۱